فلسطین-اسرائیل جنگ سے حاصل کردہ سبق!

تحریر: موشے یالون *
ترجمہ: پروفیسر اے- ڈی میکن

۲۹ ستمبر ۲۰۰۰ء کو جو یہودیوں کے کیلنڈر کے مطابق سال کا پہلا دن تھا، اسرائیل کو فلسطینیوں کی طرف سے حملوں کی ایک نئی لہر کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد فسادات اور دہشت گردی کا ایک غیر معمولی سلسلہ شروع ہوگیا۔ اسرائیل کو کم و بیش ۱۴۰ خودکش دھماکوں سے سابقہ پڑا۔ اس کے علاوہ بھی فلسطینی دہشت گردوں کی طرف سے سینکڑوں کی تعداد میں راکٹ فائر کیے گئے، جس کے نتیجے میں ۱۱۰۰ اسرائیلی (جن میں سے ستر فیصد سویلین تھے) ہلاک ہوئے۔ گو پچیس ہزار سے زائد مختلف دہشت گردانہ حملوں میں اسی عرصہ میں اکتالیس سو فلسطینی بھی مارے گئے جبکہ تیس ہزار کے قریب زخمی ہوئے۔ ان میں سے بیشتر افراد اسرائیلی انتقامی کارروائی کا نشانہ بنے۔

فلسطینیوں نے اس جنگ کو الاقصیٰ انتفادہ قرار دیا، مگر اسرائیلی ابھی اس مناقشت کو کوئی مستقل نام نہیں دے پائے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کے نزدیک یہ جنگ کئی مراحل میں لڑی گئی ہے اور ابھی اس کے اور بھی کئی مراحل ہو سکتے ہیں۔ ۲۰۰۰ء سے دونوں فریق اپنی اپنی حکمت عملی اور جنگی چالوں میں مسلسل ردوبدل کر رہے ہیں۔ اگرچہ ماضی کے مقابلے میں حالات نسبتاً پرسکون ہیں مگر فلسطینی حملے اب بھی جاری ہیں۔ تاہم موجودہ خاموشی ایک اہم موقع فراہم کرتی ہے کہ اس جنگ سے

---

* یہ مضمون The Washington Institute for Near East Policy, Policy Focus # 64, January 2007 میں Lessons from the Palestinian 'War' Against Israel کے عنوان سے شائع ہوا۔

حاصل ہونے والے سیاسی اور تزویراتی (strategic) سبق کا جائزہ لیا جا سکے۔ اسرائیل اور فلسطین کے مابین ہونے والی جنگ کے حالیہ منظرنامے سے قطع نظر اس جنگ کے بعض دوررس نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ اس وقت مغربی دنیا کو جس ''عالمی جہاد'' کا سامنا ہے اس کے باعث عراق میں امریکی فوجی دہشت گردوں سے نبرد آزما ہیں اور حال ہی میں اُردن اور مصر میں ہونے والی دہشت گردانہ کارروائیوں سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ خود مسلمان مملکتیں بھی دہشت گردی سے محفوظ نہیں۔ چنانچہ فلسطینی دہشت گردی کے خلاف اسرائیلی جنگ سے حاصل ہونے والے سبق میں دوسری قوموں کو شریک کرنے کی جتنی ضرورت واہمیت آج ہے پہلے کبھی نہ تھی۔

فلسطینی دہشت گردی کے خطرے کا ظہور

ایہود بارک نے ۲۰ جنوری ۱۹۹۹ء کو اسرائیلی وزیراعظم منتخب ہونے کے فوراً بعد شام کے ساتھ ایک امن معاہدہ کرنے اور فلسطین کے ساتھ پندرہ مہینوں کے اندر یعنی ستمبر ۲۰۰۰ء تک ''ایک حتمی مصالحت'' کو ممکن بنانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے وہ اپنی خواہش کی تکمیل نہ کر پایا۔ شام کے ساتھ مذاکرات کا یہ سلسلہ اپریل ۲۰۰۰ء ہی میں ختم ہو گیا۔ جبکہ فلسطین کے ساتھ مذاکرات پر کارروائی پہلے سست ہو گئی اور آخر کار یہ سلسلہ جولائی ۲۰۰۰ء میں کیمپ ڈیوڈ مذاکرات کی ناکامی کے بعد ختم ہی کر دیا گیا۔

فلسطینی سفارتی محاذ پر مذاکرات کی ناکامی کی دونوں پارٹیاں (اسرائیل اور فلسطینی اتھارٹی) ذمہ دار تھیں۔ جس دوران اسرائیلی قیادت کسی قابل عمل فارمولے کی جستجو میں تھی (جس سے ٹکراؤ کی کیفیت ختم ہو سکے) اسی دوران فلسطینی صدر یاسر عرفات جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔

فلسطینی علاقے ویسٹ بینک میں آٹھ فلسطینی شہر، ۴۵۰ گاؤں اور تقریباً ۱۲۰ اسرائیلی آبادیاں قائم تھیں۔ کیمپ ڈیوڈ مذاکرات کے بعد کے مہینوں میں اسرائیلی فوج کا اندازہ تھا کہ فلسطینی جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہیں اور اس بات کا زیادہ امکان تھا کہ نئی صدی کی تقریبات تک غالباً خاموشی رہے گی۔ اس کے بعد کشیدگی شروع ہوگی اور امن وامان اور تحفظ کی صورتحال بتدریج بگڑتی چلی جائے

گی۔ ان کا مزید اندازہ تھا کہ صورت حال کی خرابی ستمبر ۲۰۰۰ء کو انتہا تک پہنچ جائے گی۔ ان ممکنہ حالات کا تجزیہ عرفات کے ارادوں، حکمت عملیوں، جواز اور طرز عمل کے بارے میں ان کے ادراک پر مبنی تھا۔ عرفات کے عزائم آنے والے کئی عشروں میں تاریخ دانوں کے مابین موضوع بحث رہیں گے۔ اسرائیلی فوج کا آزاد تجزیہ یہ تھا کہ عرفات دو ریاستی فارمولے کی حمایت کرے گا، نہ اسرائیل کو ایک آزاد یہودی ریاست کے طور پر قبول کرے گا۔ اس نے ۲۹ ستمبر ۲۰۰۰ء کو دہشت گردی کی جس نئی لہر کا آغاز کیا تھا، وہ دو ریاستی فارمولے کے تدارک کے لیے ہی تھی۔ تاریخی اعتبار سے عرفات کو فلسطینی اور عرب قائدین کی حمایت حاصل تھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عرفات کو یقین تھا کہ اسرائیلی معاشرہ دہشت گردی کی اس نئی لہر کے نتیجے میں پسپائی اختیار کرتے ہوئے ہتھیار ڈالنے تک آ جائے گا اور اپنے انداز کو کیمپ ڈیوڈ مذاکرات کے دوران اختیار کیے جانے والے رویے سے بھی زیادہ نرم کر دے گا۔ چنانچہ یاسر عرفات چاہتا تھا کہ دہشت گردی کو حتی الامکان طول دے اور نتیجے کے طور پر اوسلو معاہدے کے تحت ہونے والے تصفیے کو قبول کرنے کے بجائے بہتر شرائط منوا سکے۔ بالخصوص عالمی رائے عامہ کے اکھاڑے میں، اس جنگ کے دوران اپنے موقف کو جائز ثابت کرنا اس کی اہم ترین ضرورت تھی۔ اس حوالے سے اس نے ۲۸ ستمبر ۲۰۰۲ء کو اسرائیل کے حزبِ مخالف کے رہنما ایریل شیرون کے ٹیمپل ماؤنٹ کے دورے کا بہانہ بناتے ہوئے کشیدگی کو مزید ہوا دی اور اس کے نتیجے میں فوری طور پر ایک بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی۔ صورت حال کو مزید بگاڑنے کے لیے عرفات نے اس تحریک کو ''الاقصیٰ انتفادہ'' کا نام دیا جو عربی زبان میں انقلاب یا بغاوت کا مترادف ہے۔ ایریل شیرون کے دورہ ٹیمپل ماؤنٹ کے بہانے سے عرفات کی ایک مقبول تحریک شروع کرنے کے پیچھے ایک طے شدہ حکمت عملی کارفرما تھی۔ عرفات نے یہی چال، اس سے پہلے ۲۰۰۰ء ہی میں یوم النقبۃ (یعنی یومِ آشوب) کے عنوان سے چلی تھی جو اسرائیل کے قیام کے حوالے سے فلسطینیوں نے قرار دیا تھا۔ فلسطینیوں کو اسرائیل کے خلاف سڑکوں پر لانے میں ناکامی کے بعد عرفات نے فتح تنظیم کے ایک سرگرم رکن مروان برغوتی کو حکم دیا کہ وہ طلبہ تنظیموں کو فسادات پر اکسائے۔ ان شورش پسندوں نے اس

موقع پر مجمعے کے پیچھے سے اسرائیلی فوجیوں پر گولیاں برسائیں اور نتیجہ یہ کہ پُرتشدد واقعات ہوئے جو اسرائیل کے حوالے سے فلسطینیوں کی جانب سے عرفات کی حمایت میں اضافے کا سبب بن گئے۔

ستمبر ۲۰۰۰ء میں جنگ شروع ہونے کے بعد اسرائیل کی جنگ بندی کی ساری کوششیں ناکام ہوگئیں۔ اس سلسلے میں اہم ترین کوشش ۴ اکتوبر کو پیرس میں منعقدہ ایک سربراہی کانفرنس میں کی گئی جس میں میزبان فرانسیسی صدر ڑاک شیراک تھے اور شرکاء میں عرفات، اسرائیلی وزیراعظم بارک اور امریکی سیکرٹری آف اسٹیٹ میڈلین البرائٹ شامل تھیں۔ اس کانفرنس میں عرفات نے موقف اختیار کہ چونکہ اسرائیلیوں کے ۴ فوجیوں کے مقابلے میں فلسطین کے ۷۴ شہری مارے گئے ہیں اس لیے حملہ آور اسرائیل ہے۔ یہ دعویٰ عرفات کی مخصوص افسانہ طرازی کے انداز کی ایک مثال تھی کیونکہ فی الحقیقت ۲۹ ستمبر سے ۴ اکتوبر تک یعنی جنگ کے پہلے ہفتے کے دوران ۴۷ فلسطینی ہلاک ہوئے تھے، یہ تعداد عرفات کے دعوے سے کہیں کم تھی۔ مزید برآں ان اعداد وشمار سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسرائیل اپنے دفاع کے لیے پوری طرح تیار تھا، جس کا اسے بہت پہلے اس وقت اندازہ ہوگیا تھا جب کیمپ ڈیوڈ کے مذاکرات کے دوران عرفات نے تمام منصوبے رد کردیے تھے۔

بہرحال عرفات جب پیرس کی سربراہی کانفرنس میں آیا تو خود کو ایک مظلوم اور گرا پڑا شخص ظاہر کررہا تھا۔ اور اس نے اسرائیل کی فوجی برتری کو بڑی خوبصورتی سے اسرائیلی تشدد پسندی کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی۔ کانفرنس کے اختتام پر صدر شیراک کی شہ پر عرفات نے پہلے سے طے شدہ جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کردیا۔ اس کی اس حرکت سے یہ شبہات یقین میں بدل گئے کہ عرفات مسئلے کے پرامن حل کے حق میں ہی نہیں ہے۔

فلسطین کی دہشت گردانہ صلاحیت

اوسلو معاہدے پر دستخط کرنے سے کہیں پہلے فلسطین کے انداز عمل اور دہشت گردانہ صلاحیت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اوسلو امن مذاکرات کے ابتدائی دنوں میں علاقہ اے، جو بڑی بڑی کاروباری عمارتوں پر مشتمل تھا، کی سیکیورٹی فلسطینی اتھارٹی نے سنبھال لی۔ چنانچہ یہ علاقہ فلسطینی دہشت گرد

تنظیموں کے لیے محفوظ پناہ گاہ ثابت ہوا اور انہیں پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا۔ غزہ میں حماس کو کارروائیاں کرنے کی آزادی تھی۔ یحیٰ عیاش نے بھی ایک مرکز قائم کرلیا جس سے وہ خودکش بم دھماکوں کی نگرانی کرتا تھا۔ یہ سلسلہ ۱۹۹۴ء اور ۱۹۹۵ء کے دوران جاری رہا یہاں تک کہ ۵ جنوری ۱۹۹۶ء کو اسرائیلی فوج نے یحیٰ عیاش کو ہلاک کردیا۔

عرفات نے دہشت گرد تنظیموں کو ختم کرنے میں لیت ولعل سے کام لیا۔ یہاں تک کہ جب اس نے حماس کے ۱۲۰۰ سرگرم کارکن ۱۹۹۶ء میں گرفتار کیے (جو دراصل امریکہ کے دباؤ پر کی گئی کارروائی تھی) ان میں سے کسی بھی فرد کے خلاف مقدمہ درج کیا گیا نہ انہیں اسرائیلیوں کے قتل کے جرم میں سزا ملی۔ اور اگر ان پر کوئی الزام لگا بھی تو امن وامان میں خلل ڈالنے اور فلسطین کے مفادات کو نقصان پہنچانے کا تھا، اسی لیے وہ ایک طرف سے حوالات میں گئے اور دوسری طرف سے نکل گئے۔

یروشلم کے قدیم شہر میں ہاشمونی سرنگ کھولنے کے ردعمل کے طور پر ستمبر ۱۹۹۶ء میں اسرائیل کے خلاف ہنگامے کرانے میں کامیاب ہونے کے بعد عرفات نے الفتح تنظیم کے سرگرم ارکان کو ایک نئی جنگ کی تیاری کے لیے مسلح کرنا شروع کردیا۔ ان دنوں حماس اور فلسطینی اسلامی جہاد نامی تنظیموں نے سڑک کنارے نصب بموں یا خودکش بم دھماکوں کے ذریعے غزہ اور مغربی کنارے کی آبادیوں میں بارود کے ذریعے کارروائی کرنے کی تیاریاں شروع کردیں۔ غزہ میں فلسطینی اتھارٹی اور حماس مل کر ہینڈ گرنیڈ اور مارٹر گولے بنانے لگے تھے۔ اس کے لیے فلسطینی اتھارٹی کے مخصوص ٹھکانوں کے علاوہ نجی ورکشاپوں کو بھی استعمال کیا جارہا تھا۔

اس صورت حال کا ایک اہم سنگِ میل اس واقعے کو قرار دیا جاسکتا ہے جس میں ۱۰ ستمبر ۱۹۹۸ء کو اسرائیلی فوج نے حماس کے ایک راہنما عواض اللہ اور اس کے بھائی کو قتل کردیا۔ عواض اللہ کے پاس سے ایک تھیلا برآمد ہوا جس میں ایسے کاغذات پائے گئے جن سے پتہ چلتا تھا کہ فلسطینی ایسا کیمیائی مواد ڈھونڈ رہے تھے جنہیں اپنے ہتھیاروں اور گولہ بارود میں استعمال کرسکیں۔ اگرچہ حماس ہتھیاروں کی تیاری یا حصول میں ناکام رہی تاہم اسرائیل کو ایسے شواہد مل گئے کہ اس سے قبل حماس نے دھماکے

دار ہتھیاروں میں بعض زہریلے مادے شامل کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ ہلاکتوں میں اضافہ ہو سکے۔

ستمبر ۲۰۰۰ء میں دہشت گرد حملوں کے بعد فلسطینیوں کی دہشت گردی کی صلاحیت بتدریج بہتر ہوئی۔ اس بہتری میں دو عوامل نے خاص طور پر حصہ لیا۔ اول یہ کہ نئے نئے دہشت گرد گروہ بن گئے۔ ان میں الاقصیٰ شہدا بریگیڈ بھی شامل تھی جو الفتح اور اس کی غزہ میں قائم ایک شاخ پاپولر ریزسٹنس کمیٹی سے ابھری تھی۔ دوسرا یہ کہ نئے نئے ہتھیار استعمال ہونے لگے۔ ان میں سے کچھ مقامی طور پر تیار کیے گئے تھے جبکہ کچھ مصر سے سمگل ہو کر آئے تھے۔ حماس نے قسام راکٹ تیار کر لیے جن سے اسرائیلی شہروں اور قصبوں پر غزہ کے علاقے سے حملے ہوتے تھے۔ فلسطینی اتھارٹی اور حماس مل کر اسلحہ بارود کی ایک بڑی مقدار اس زیرزمین سرنگ کے ذریعے سمگل کر کے فلسطین میں لانے میں کامیاب ہوئے جو سنائی اور غزہ کے درمیان خفیہ طور پر کھودی گئی تھی۔ سمگلنگ کی ان ہی کارروائیوں کے ذریعے فلسطینیوں نے راکٹ کے ذریعے پھینکے جانے والے گرینیڈ (RPGs) کے ساتھ جدید دھماکہ خیز مواد بھی حاصل کر لیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایئر ڈیفنس اینٹی ٹینک میزائل راکٹ حاصل کرنے کی کوشش بھی کی۔ البتہ اسرائیلی ڈیفنس فورس نے سمگلنگ کی ایسی بہت سی کارروائیاں ناکام بھی بنائیں۔ ان ہی میں جنوری ۲۰۰۲ء میں کیرائن-اے نامی بحری جہاز پر چھاپہ مارنا بھی شامل ہے جو اسلحے اور بارود کی ایک بڑی کھیپ ایران سے غزہ لے جا رہا تھا۔

کسی طرح کی نگرانی نہ ہونے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فلسطینی اتھارٹی اور جہادی تنظیموں نے اسلحے بارود کی ایک اچھی خاصی مقدار بذریعہ سمگلنگ اکٹھی کر لی۔ بہرحال سمگلنگ کی ان کارروائیوں کے بعد اب فلسطین کے پاس معیار و مقدار دونوں اعتبار سے خاصا اسلحہ موجود ہے جس میں ریکائل لیس انٹی ٹینک توپیں، کتوشا راکٹ، اینٹی ٹینک اور اینٹی ایئر کرافٹ میزائل تک شامل ہیں۔

گزشتہ دو دہائیوں کے دوران فلسطین کی دہشت گردی کے طریق کار کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی چالوں میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ اسرائیل کے خلاف مناقشتی کارروائیوں کو کئی درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان میں قریبی علاقوں سے پتھر اور ہینڈ گرینیڈ پھینکنا وغیرہ شامل ہے۔

اس کے علاوہ فلسطینی دہشت گرد اسرائیلیوں پر چھپ کر فائر کرنے، سڑک کے کنارے بم نصب کرنے، مارٹر اور قسام راکٹ کے ذریعے بالواسطہ فائرنگ، آر پی جی یا انٹی ٹینک میزائل کے براہ راست حملوں میں بھی ملوث ہیں۔ بعض اوقات یہ ایسے حملے کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں جن میں بہت سے افراد لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔ ایسے کامیاب حملوں سے حملہ آوروں کو اور بھی کئی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان میں بڑے بڑے انسان کش حملوں کے علاوہ اسرائیلی افراد کو زندہ یا مردہ یرغمال بنانے کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔

فلسطینی خطرے کی نوعیت: دہشت گردی بمقابلہ روایتی جنگ

اگرچہ ستمبر ۲۰۰۰ء کی اسرائیل۔فلسطین لڑائی اتنی ہی شدید تھی جتنی دو باقاعدہ فوجوں کے درمیان ایک روایتی جنگ ہوسکتی ہے مگر اس کی بعض خاصیتیں روایتی جنگ سے قطعی مختلف تھیں۔ روایتی جنگ میں یہ ہوتا ہے کہ مخالف فوجیں اپنی عسکری چالوں، فائر کی قوت اور حرکت میں اپنے حریف پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتی ہیں مگر جب سامنا ایک دہشت گرد تنظیم سے ہو تو اعلیٰ درجے کی فائر کی طاقت بھی فتح کی ضمانت فراہم نہیں کر سکتی۔ اس حوالے سے ہدف، عسکری چالیں، جنگ کا ماحول اور مقاصد کے علاوہ دشمن کی نوعیت اور اس کے جنگی محرکات وغیرہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کو خاصہ پیچیدہ بنا دیتے ہیں۔ خصوصاً اس فوج کے لیے یہ خاصا مشکل کام ہے جس کی تربیت خالصتاً روایتی جنگ میں فوقیت حاصل کرنے کی بنیادوں پر کی گئی ہو۔

اصولی طور پر دہشت گرد باضابطہ فوج سے براہ راست ٹکرانے سے اجتناب کرتے ہیں۔ اس کی بجائے وہ ذرا ''نرم ٹارگٹ'' کو پسند کرتے اور نہتے شہریوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک براہ راست لڑنے والوں اور میدان جنگ سے باہر کے لوگوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا کیونکہ ان کا مقصد سویلین آبادی میں خوف اور اضطراب پیدا کرنا ہوتا ہے۔ درحقیقت حملوں سے ہونے والے مادی نقصانات کے ساتھ ساتھ دہشت پھیلا کر وہ کچھ اضافی مفادات بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً سب سے اہم یہ کہ وہ جس ملک کے خلاف دہشت گردی کرتے ہیں اس کی معیشت کو نقصان پہنچانا ان کا

مقصد ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ناگہانی حملوں کے خوف سے مارکیٹ میں خریداری کرنے والوں کا اعتماد منتشر ہوتا ہے اور یوں مارکیٹ کی سرگرمی متاثر ہوتی ہے۔ دوسرے اس سے معاشرے کے اس طبقے کے حوصلے پست کرنا مطلوب ہوتا ہے جو اصل نشانہ ہوں، تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ خوف کے ہاتھوں مغلوب ہو جائیں اور دہشت گردوں کے حوصلے بلند ہوں۔ آخر میں یہ کہ متواتر دہشت گردی کے نتیجے میں ٹارگٹ گروپ یہ سوال کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ آخر اس کا جواز کیا ہے؟ (اس کے نتیجے میں یہ سوال عالمی سطح پر بھی پیدا ہو سکتا ہے) اور یہ بات یہاں تک پہنچ سکتی ہے کہ ٹارگٹ سوسائٹی اپنے قومی مفادات کے بارے میں مشکوک ہو کر ان میں تبدیلی کی خواہش کرنے لگے۔ حالیہ ٹکراؤ کے نتیجے میں فلسطینی دہشت گردوں نے بسوں، کافی کی دوکانوں، ریستورانوں اور پرہجوم سڑکوں پر ایسے ہی مفادات کے حصول کے لیے کارروائیاں کی ہیں۔

جمہوری معاشروں میں انسانی جانوں کی بڑی قدر ہوتی ہے۔ اس جذبے کو بھی دہشت گرد ناجائز طور پر استعمال کرتے ہیں۔ خلافِ دہشت گردی کارروائیوں میں عموماً دونوں طرف سے جانی و مالی نقصان ہوتا ہے۔ چنانچہ دہشت گرد ایسے نقصان کو اجاگر کرتے، اندرونِ ملک یا بین الاقوامی سطح پر ایسی کارروائیوں کے جواز کو چیلنج کرتے اور عالمی رائے عامہ کا جذباتی بلیک میل کرتے ہیں۔ اس حوالے سے فلسطینی دہشت گردوں نے اسرائیلی معقولیت، مقامی اقدار اور انسانی زندگی کے احترام سے متعلق پورا پورا ادراک رکھنے کے باوجود اپنے دہشت گردانہ حملوں میں انتہائی گنجان آبادی اور بھرپور بازاروں کو نشانہ بنایا۔ ظاہر ہے کہ اس ضمن میں کیے گئے مدافعانہ اقدامات مثلاً ٹریفک چیک پوائنٹس، راستوں کی بندش اور کرفیو وغیرہ جیسی کارروائیاں فلسطینیوں کے لیے مشکلات کا باعث بنیں اور ان کے سول حقوق کی خلاف ورزی ہوئی اور اسے استعمال کرتے ہوئے فلسطینیوں نے اس بہانے سے اپنی سرگرمیوں میں اور شدت پیدا کی اور یوں عالمی فورموں پر اسرائیلی کارروائی کے جواز کو چیلنج کیا گیا۔

چنانچہ فلسطین کے خلاف ان کارروائیوں کو جارحیت قرار دے دیا گیا۔ اس کی سب سے بڑی مثال اپریل ۲۰۰۲ء میں جنین میں کیا جانے والا حملہ ہے جسے فلسطینیوں نے قتل عام کا نام دیا۔ حالانکہ

ان مارے جانے والے ۵۳ افراد میں سے ۴۸ مسلح دہشت گرد تھے۔ علاوہ ازیں اس لڑائی میں ۲۳ اسرائیلی سپاہی اور افسران بھی ہلاک ہوئے جو اس امر کی دلیل ہے کہ دونوں متحارب گروہوں میں کہیں نہ کہیں برابری کا عنصر موجود تھا۔ اس وقت میں ڈپٹی چیف آف سٹاف تھا اور میرا مشاہدہ ہے کہ اسرائیلی فوج نے انسانی جان اور آبرو کے تحفظ کی حتی الامکان کوشش کی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ وسائل رکھنے کے باوجود اسرائیل نے ہوائی حملہ کرنے کی بجائے زمینی کارروائی کو اولیت دی۔ حالانکہ اس طرح اسرائیلی فوجیوں کو بھی مخالف فائرنگ کی زد میں آنا پڑا اور یوں ان کے اتنے لوگ مارے بھی گئے۔ ایسی باتوں کو ملحوظ رکھنے کے باوجود اسرائیل کو ایسے فلسطینی پروپیگنڈے کا سامنا کرنا پڑا کہ ''نہتے فلسطینیوں کے خلاف طاقت کا بے دریغ استعمال کیا گیا''۔

یہ واقعہ بہت سی مثالوں میں سے ایک ہے جس کے ذریعے فلسطین نے غلط البنیاد ہونے کے باوجود بڑی آسانی سے اسرائیل کو ظالم اور سفاک قرار دے دیا، باوجودیکہ فلسطینیوں نے صورت حال کو بغیر کسی اعلانِ جنگ کے خراب کیا اور جنگ کی صورت حال پیدا کر دی جس کا مقصد اسرائیل کو خود دفاعی حق سے محروم کرنا اور عرب اور مسلمان رائے عامہ کو اس کے خلاف بھڑکانا تھا۔

اسرائیل کا ردِعمل

ابتداء سے ہی اسرائیل کا فلسطینی دہشت گردی کے خلاف عسکری ردعمل سیاسی موقف کے عین مطابق رہا البتہ جیسے جیسے اس جنگ میں شدت آتی گئی اسرائیل کا عسکری ردعمل بھی بدلتا گیا۔ مقصد اس کے علاوہ کچھ نہ تھا کہ دہشت گردی کے خطرے سے کماحقہ نمٹا جا سکے۔

ابتداء میں اسرائیلی حکومت کا تشدد کے خلاف ردعمل ملا جلا تھا۔ حکومت میں موجود کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ فلسطینی تشدد کی نئی لہر عالمی متشددانہ ماحول کا شاخسانہ ہے مگر بعض لوگ سمجھ رہے تھے کہ تشدد کی نئی لہر دراصل یاسر عرفات کی سوچی سمجھی سکیم کا نتیجہ ہے جس کے ذریعے وہ سیاسی فوائد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ شروع شروع میں اس پر اتفاق ہو گیا کہ اس سلسلے میں عرفات کو ان معاملات کا براہ راست سرغنہ قرار نہ دیا جائے تاکہ عالمی رائے عامہ کی نظر میں اس کے اعتماد اور جواز کو دھچکا نہ لگے اور اسرائیل

اسے قیام امن کے عمل میں ایک موثر شریک کار کے طور پر کام کرنے کا موقع دے۔

صرف ۹ ماہ کے اندر اندر حکومت کو فلسطینی متشددانہ کارروائیوں میں عرفات کے کردار کے حوالے سے اپنے گزشتہ فیصلے کو تبدیل کرنا پڑا جب ۲ جون ۲۰۰۱ء کو ڈالفنیریم پر خودکش حملے کے نتیجے میں ۲۱ اسرائیلی (جن میں زیادہ تر تیرہ سے انیس سال کی عمر کے افراد تھے) مارے گئے اور ۱۲۰ زخمی ہوئے تو اسرائیلی حکومت کو یہ بیان جاری کرنا پڑا:

''یہ عرفات ہی ہے جو دہشت گردی کو جنم دیتا اور اسے قوت پہنچاتا ہے''۔

اس کے باوجود اسرائیلی پالیسی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ صرف اس فیصلے تک معاملہ محدود رہا کہ عرفات امن کے منصوبے کے لیے معقول شراکت دار نہیں ہے۔ اسرائیلی پالیسی کے ارتقاء کا تیسرا مرحلہ وہ ہے جب عرفات کے بارے میں حکومت کا نقطۂ نظر مستحکم ہوگیا۔ گویا اب اس میں واپسی کی گنجائش نہ تھی۔ یہ ۲۰۰۲ء کی بات ہے جب ۲۹ مارچ کو حماس کے بمبار نے نتانیا پارک ہوٹل میں دھماکہ کر دیا۔ جو دراصل Passover کے حوالے سے چھٹی کا دن تھا۔ اس سے اگلی صبح ہی کو اسرائیل حکومت نے عرفات کو ایک دشمن قرار دے دیا۔ اور نتیجے کے طور پر اسرائیلی دفاعی فورس کو اختیار دے دیا کہ وہ آپریشن ڈیفنسو شیلڈ پر عمل کر دے (جو شاید عرفات کو ختم کرنے کا کوڈ اشارہ تھا)۔

فوجی نقطہ نظر سے اس جھگڑے کی پیچیدہ کیفیت کا تقاضا تھا کہ اسرائیلی دفاعی قوت یہ ذمہ داری پوری کرنے کے لیے بہت سی تیاری اور منصوبہ بندی کرے۔ تشدد کی نئی لہر کے ابتدائی دنوں سے ہی اسرائیلی پالیسی کے خلاف پورے ملک میں جلسے جلوس نکلنا شروع ہوگئے تھے جن میں سے اکثر تشدد پر بھی منتج ہوتے تھے۔ ان واقعات کے دوران اسرائیلی ڈیفنس فورس کو فلسطینی جنگبازوں پر گولی چلانا پڑی جو نوجوان افراد پر مشتمل جلوس کی پشت سے اسرائیلی فوجیوں پر فائرنگ کر رہے تھے۔ فائر کرنے والے یہ لوگ اکثر الفتح کے ارکان ہوتے جن کی معاونت فلسطین کی پولیس اور سکیورٹی کی تنظیم کے ارکان کر رہے ہوتے۔

ستمبر ۲۰۰۰ء تک اسرائیلی ڈیفنس فورس کے ارکان نے چونکہ ستمبر ۱۹۹۶ء اور مئی ۲۰۰۰ء میں ایسی

سرگرمیوں کا مقابلہ کیا تھا اس لیے وہ اس معاملے کے لیے تیار تھے اور حفاظتی انتظامات کر چکے تھے۔ ماضی کے اس تجربے کی روشنی میں اب ڈیفنس فورسز نے نئی تکنیک اور چالیں استعمال کرنا شروع کر دیں تاکہ دونوں طرف کے عام شہریوں کو نقصان پہنچائے اور خود بھی براہ راست خطرے کا سامنا کیے بغیر دہشت پسندوں سے نمٹ سکیں۔ اجتماع کو کنٹرول کرنے کے طریق کار کو اپناتے ہوئے محافظین کو دو سطحوں پر متعین کیا جانے لگا۔ بعض لوگ جلوسوں کے بالکل آگے آگے رہتے اور فلسطینی فائرنگ سے محفوظ رہنے کا بندوبست رکھتے۔ دوسرا گروپ جن میں چھاپہ مار کارروائی کے ماہر افراد شامل ہوتے جو ہجوم کے چاروں طرف ایک خاص محیط میں موجود رہتے اور چھپ کر حملہ کرنے والوں سے تحفظ کے ساتھ ساتھ موقع کی صورت حال سے عسکری مقامی کمان کو آگاہ رکھتے اور آپس میں رابطے میں رہتے۔ یہ چالیں بڑی حد تک کامیاب رہیں۔ ۲۹ ستمبر ۲۰۰۰ء کے بعد والے ہفتے کے دوران درجنوں فلسطینی (جو چھپ کر فائر کرنے والے تھے) ہلاک کر دیے گئے۔ اس میں حیرت نہیں کہ یاسر عرفات نے اس کارروائی کو بھی اسرائیل کی جارحیت کہہ کر پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔

کوئی دو ہفتے کے جلوسوں، ہنگاموں اور فائرنگ کے نتیجے میں فلسطینی طریق کار میں تبدیلی واقع ہوئی۔ مثال کے طور پر جب فلسطینی اتھارٹی نے دو ہفتے کی ہڑتال کے بعد اپنے تعلیمی ادارے دوبارہ کھول دیے تو فلسطینی شرپسندوں نے نہ صرف حملوں کی رفتار کم کر دی بلکہ جلوس کے پیچھے سے حملوں کا سلسلہ بھی بند کر دیا۔ اس کے بجائے انہوں نے آس پاس کی بستیوں میں اسرائیلی نہتے افراد، صنعتی زونوں اور ملٹی نیشنل تنصیبات کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ یہاں بھی IDF نے جوابی فائر کی صورت میں ردعمل ظاہر کیا۔

فلسطینی پالیسی میں ایک اور تبدیلی ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۰ء کو شروع ہوئی جب IDF کے دو اہلکار غلطی سے اپنی کار راملہ میں لے گئے۔ جب انہوں نے فلسطینی پولیس والے سے راہنمائی چاہی تو وہ انہیں پولیس اسٹیشن کے اندر لے گیا جہاں ان سے پوچھ گچھ کیے بغیر ایک مجمعے نے انہیں ہلاک کر ڈالا۔ چنانچہ اسرائیل نے فلسطینی اتھارٹی کو مجرم قرار دیتے ہوئے کہا کہ وہ ان ''بھولے بھٹکے'' سپاہیوں کو

قانونی تحفظ دینے میں ناکام رہی ہے۔ چنانچہ انٹی ٹینک میزائل سے لیس ہیلی کاپٹر کے ذریعے اس پولیس اسٹیشن کونشانہ بنایا گیا۔ اس طرح کے آپریشن فلسطینی اتھارٹی کے خلاف جاری رکھے گئے کیونکہ وہ بدامنی پر قابو پانے میں ناکام ہوگئی تھی۔ ایسی کارروائیوں میں صرف مالی اور مکانات وغیرہ کا نقصان ہوتا تھا، جانی نقصان سے اجتناب برتا جاتا تھا۔ اس کارروائی کے جواب میں اکتوبر ۲۰۰۰ء کے دوران یاسر عرفات نے جیلوں میں قید بہت سے دہشت گردوں کو رہا کر دیا۔ یہ گویا ایک اشارہ تھا جس کے ردعمل کے طور پر حماس، فلسطینی اسلامی جہاد اور دوسرے دہشت گرد گروپ بھی جنگ میں عملاً شامل ہو گئے۔

اسرائیلی حکومت اور ریاست کو ایسی دہشت گردیوں کے ایک طویل سلسلے کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ دہشت گردانہ حملوں کا ایک غیر معمولی سلسلہ شروع ہو گیا تھا، جو ۲۰۰۲ء کے ابتدائی مہینوں کو انتہائی خطرناک صورت اختیار کر گیا۔ چنانچہ ۲۹ مارچ کو (یعنی جنگ کے آغاز کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد) حماس کے ایک بمبار نے شانیہ میں پارک ہوٹل کو نشانہ بنایا جہاں یہودی ایک تہوار Passover کے سلسلے میں کھانے کے لیے جمع تھے۔ لہٰذا اس موقع پر ہی آپریشن ڈیفنس شیلڈ (Operation Defence Shield) کا باقاعدہ آغاز کر دیا گیا جس کا مطلب تھا کہ اب اسرائیلی فلسطینی دہشت گردوں کے خلاف دفاعی کارروائی کی بجائے offensive کارروائیوں کو ترجیح دیں گے۔ چنانچہ ایسے فلسطینی حملوں کے خلاف اسرائیل کا طریق کار بتدریج بدلا۔ مثلاً پہلے مرحلے پر اسرائیلی حکومت نے فلسطینی اتھارٹی کو امن کے قیام اور دہشت گردی کی روک تھام کے لیے ایک موثر معاون قرار دیا تھا۔ جب یہ بےنتیجہ رہا تو اسرائیل نے آہستہ آہستہ فلسطینیوں کو دی گئی مراعات کو نشانہ بنانا شروع کیا تاکہ یاسر عرفات کو اس نقصان کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکے۔ اس کے بعد IDF نے پورے ملک کے طول وعرض میں دہشت گردوں سے براہ راست مقابلہ کرنے کی پالیسی اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ فلسطین کے زیر انتظام علاقے -اے (Area-A) کے لیے چھاپے مارے گئے مگر فلسطینی اتھارٹی پر براہ راست حملوں سے پھر بھی اجتناب کیا گیا۔

اسرائیل نے اس صورت حال اور ان حالات میں فلسطینی آبادی پر کچھ پابندیاں عاید کیں جن میں چیک پوسٹوں کا قیام، راستوں کی بندش اور سول کرفیو وغیرہ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں فلسطینی اتھارٹی کے اردگرد فوجیں تعینات کر دی گئیں تا کہ وہ اسرائیلی حدود میں داخل نہ ہو سکیں۔ جنگ کے ابتدائی ایام (یعنی ستمبر ۲۰۰۰ء سے مارچ ۲۰۰۲ء تک) ایسے آپریشن مغربی کنارے کے علاقے کے مقابلے میں غزہ کی پٹی میں کہیں آسان ثابت ہوئے کیونکہ غزہ میں ایک حفاظتی باڑ پہلے ہی سے لگا دی گئی تھی۔ اسرائیل کے اندر بھی اس حوالے سے حفاظتی اقدامات کیے گئے۔ اس حوالے سے شہر میں داخلے کے راستوں پر اور ان کے اردگرد چیک پوائنٹ قائم کیے گئے، پبلک مقامات اور سہولیات پر گارڈ متعین کیے گئے اور اس خطرے سے متعلق اپنے عوام میں شعور بیدار کیا گیا جس کے باعث بہت سے حملے ٹل گئے اور جانی نقصانات میں بھی کمی آئی۔

آپریشن ڈیفینسو شیلڈ کے باعث فلسطینی اتھارٹی کے خلاف بھرپور اور متواتر کارروائیاں کی گئیں اور فوجی پالیسی کو بھی دفاع سے پیشگی حملے کی پالیسی کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ چنانچہ ۲۹ مارچ ۲۰۰۲ء کے بعد خود کش حملوں کے نتیجے میں اسرائیلیوں کے مرنے کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ کے چند اصول

دہشت گردی کے خلاف مسلسل جنگ کے میرے تجربے نے مجھے بعض ایسے سبق دیے ہیں جن کا یہاں ذکر ضروری ہے:

(i) دہشت گردی کے خلاف ہتھیار ڈالنے سے دہشت گردی میں اضافہ ہوتا ہے: یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ ہتھیار ڈالنے سے دہشت گردی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہ تاریخ کا اہم ترین سبق ہے۔ حالیہ تاریخ میں اس کی مثالیں دستیاب ہیں۔ مثلاً

- ۱۹۸۳ء میں حزب اللہ کے ایک دہشت گرد نے بیروت کے مضافات میں ان امریکی فوجیوں پر بم پھینکا جو وہاں قیام امن کی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ اس کارروائی کے جواب میں امریکی فوجیں علاقے سے نکل گئیں اور آج تک حزب اللہ اور اس کے بانی ملک نے اس کی کوئی قیمت ادا

نہیں کی اور نہ ہی قیام امن ممکن ہو پایا ہے۔

- ۱۹۸۹ء میں افغانستان میں مسلمان گوریلا جنگ بازوں کے خلاف لڑتے ہوئے روسی ۱۰ سالہ قبضے کے بعد خطے سے نکل گئے۔ اس کامیابی کو افغانستان کی بجائے مسلم مجاہدوں کی کامیابی گردانا گیا۔ نتیجہ یہ کہ افغانی انتہا پسند مسلمانوں کا حوصلہ اس قدر بڑھا کہ وہ دوسرے مخالفین پر بھی حملہ کرنے لگے۔ لہٰذا ایک سپر پاور کے خلاف کامیابی کے بعد انہوں نے مقامی طور پر القاعدہ قائم کر کے ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو حملہ کر دیا۔
- اسی طرح اگست ۲۰۰۵ء میں غزہ سے اسرائیل کی واپسی نے دہشت گردی کو مزید ہوا دی۔ گویا کسی بھی طرح کی کمزوری کا اظہار نہ صرف دہشت گردوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے بلکہ انہیں ایک اخلاقی جواز بھی فراہم کر دیتا ہے۔

(ii) معاشرتی اتحاد ہی قومی قوت کی بنیاد ہے: دہشت گرد عموماً نہتے شہریوں کو نشانہ بناتے ہیں اس سے ایک تو شہریوں میں خوف و ہراس پھیلتا ہے۔ دوسرے معاشی اور معاشرتی کمزوری کی صورت میں ریاست کی آئندہ مقابلے کی صلاحیت بھی کمزور پڑتی ہے۔ اس لیے معاشرے کو ہتھیار ڈالنے کی بجائے نقصان کو برداشت کر کے حوصلوں کو بلند رکھنا چاہیے۔

جمہوری معاشرے اس ضمن میں اور بھی کمزور ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً میڈرڈ میں ٹرین میں بم پھٹنے کا قومی ردعمل یہ تھا کہ قوم نے الیکشن میں ایسی حکومت منتخب کر دی جنہوں نے عراق سے اپنی فوج واپس بلالی۔

اغوا اور یرغمال بنانے کی کارروائیاں عام لوگوں کی توجہ اور بھی جلد اور آسانی سے حاصل کر کے دہشت گردوں کے مطالبات تسلیم کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ حالیہ عراقی جھگڑے میں فرانس اور جرمنی نے تاوان دے کر قیدیوں کے بدلے قیدی رہا کر کے معاملات چکائے ہیں۔

اسرائیلی عوام نے اس سلسلے میں بڑے حوصلے سے کام لیا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اسرائیلی عوام نے ۱۹۸۲ء سے ۲۰۰۰ء کے درمیان لڑی جانے والی جنگ کے مقابلے میں حالیہ اسرائیل فلسطین جنگ

کے دوران کہیں بہتر رویہ ظاہر کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قیادت اور تعلیم کا دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اہم کردار ہے۔

(iii) **دہشت کے خلاف جنگ میں قیادت کا کردار:** دہشت گردی کے خلاف جنگ قوم کی قیادت کے لیے سیاسی اور تزویراتی دونوں سطحوں پر سب سے بڑا چیلنج ثابت ہوتی ہے۔ یہ سیاسی قیادت کا کام ہے کہ وہ عوام کو قائل کرے کہ دہشت گردی کو شکست دی جاسکتی ہے۔ البتہ اس کے لیے وقت درکار ہوتا ہے اور کچھ جانوں کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ اس لیے ہتھیار ڈالنے کی بجائے مشکل حالات میں بھی جنگ جاری رہنی چاہیے۔ روایتی جنگوں میں فوج کے جانی نقصان سے بھی قوم کے حوصلے متاثر ہوتے ہیں اور جب دہشت گردی کے خلاف جنگ میں خود عوام کی لاشیں گرنے لگیں تو مسئلہ انتہائی سنگین ہو جاتا ہے۔ فوجی قیادت کے لیے بڑا چیلنج فتح کی قابل قبول تعریف پیش کرنا ہے۔ میرے خیال میں دہشت گردی کے خلاف فیصلہ کن فتح یہ ہے کہ دہشت گرد، ان کے سرپرست اور ان کی سیاسی قیادت یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ دہشت گردانہ کارروائیوں کی قیمت (جان و مال کی صورت میں) مفادات سے کہیں زیادہ ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ ناک آؤٹ کرنے کی بجائے پوائنٹس کی بنیاد پر جیتی جاتی ہے حالیہ تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

(iv) **دہشت گردی کے خلاف جنگ میں تعلیم کا کردار:** دہشت گردی کے مسئلے سے دوچار قوم کو مستقل طور پر فرنٹ لائن پر رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس قومی عزم و حوصلے کے قیام میں سب سے بڑا کردار تعلیم کا ہے۔ اس سے قوم اپنے موقف کو سمجھ کر اس پر کھڑی رہ سکتی ہے۔ یہ تعلیم ہی ہے جس کے ذریعے قوم دہشت کے خلاف جسمانی اور نفسیاتی دونوں پہلوؤں سے قوتِ مدافعت پیدا کرتی ہے۔

ستمبر ۲۰۰۰ء میں شروع ہونے والے تشدد کے سلسلے کے دوران اسرائیلی قوم بالعموم اور نوجوان نسل بالخصوص ایسی خصوصیات سے عاری ثابت ہوئی۔ دراصل ۱۹۹۰ء کی دہائی سے اسرائیلی یہ سنتے چلے آرہے تھے کہ وہ ایک لامتناہی امن کے عہد میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس لیے دہشت گردی کا نیا سلسلہ ان کے لیے غیر متوقع تھا۔ دراصل یہ اسرائیلی افراد اپنی تہذیب اور ورثے کے علم سے عاری

تھے۔ مجھے خود اپنے ماتحت فوجیوں کے ذریعے اس کمزوری کا ادراک ہوا کہ وہ اسرائیل۔فلسطین مناقشت کے پس منظر سے آگاہ نہیں تھے۔ نہ انہیں یہ ادراک تھا کہ دنیا میں ایک مستقل یہودی ریاست کے قیام کی کیا اہمیت ہے، ان کا صیہونی اور یہودی ورثہ کیا ہے۔ عدل کی حقیقت اور اس کی روشنی میں اسرائیلی مقصد سے عدم آگاہی اور اس ضمن میں شکوک وشبہات اس قوت کے لیے زہر قاتل ثابت ہوئے جو دہشت گردی کے خلاف جنگ کی بنیادی ضرورت تھی۔ چنانچہ میں نے بطور چیف آف سٹاف ایک ایسے تعلیمی پروگرام کا آغاز کیا جس سے فوج میں آنے والے نئے جوانوں کو یقین اور مشن کا وہ ادراک حاصل ہوا جو انہیں دہشت گردی کے خلاف جنگ میں درکار ہے۔

(v) بہترین دفاع کامیاب جارحیت میں پوشیدہ ہے: دہشت گردی کے خلاف جنگ کو سیاسی، معاشی، تہذیبی، نفسیاتی، عدالتی اور عسکری جیسے ہر محاذ پر لڑنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے دہشت گردی کے خلاف جو طویل جنگ لڑی اس سے یہ سبق حاصل کیا ہے کہ بہترین دفاع دراصل کامیاب جارحیت میں پوشیدہ ہے۔ بالخصوص ۲۹ ستمبر ۲۰۰۰ء سے ۲۹ مارچ ۲۰۰۲ء تک اسرائیل نے اپنے تحفظ کے لیے مکمل طور پر دفاعی انداز اختیار کیے رکھا۔ اس لحاظ سے IDF، اسرائیلی سیکیورٹی ایجنسی (ISA) یا شین بیٹ اور اسرائیلی پولیس کو فلسطینی شہری علاقوں کے چاروں طرف تعینات کیا گیا جن کا مقصد صرف دفاع کرنا تھا۔ اور وہ بھی اوسلو معاہدے کے مطابق خالصتاً فلسطینی اتھارٹی کے کنٹرول میں تھے۔ ایسے انتظامات میں چیک پوسٹوں کا قیام، اور آبادی کے علاقوں میں معمول کی پٹرولنگ شامل تھی جن کا مقصد اس امر کو یقینی بنانا تھا کہ کوئی غیر متعلق فرد بارڈر پار کر کے اسرائیل میں داخل نہ ہو سکے۔ اس کے علاوہ جب کبھی اسرائیلی دفاعی فورس نے جارحانہ کارروائی کی تو وہ بم حملوں کے جواب میں کی گئی اور ان میں فلسطینی اتھارٹی کو نشانہ بنایا گیا تاکہ فلسطینی دہشت گردوں پر دباؤ ڈال کر انہیں متشددانہ کارروائیوں سے باز رکھا جائے۔ البتہ اسرائیل نے دہشت گرد تنظیموں کی بجائے فلسطینی اتھارٹی کو ان کارروائیوں کا ذمہ دار قرار دیا۔

شانیا کے علاقے کے پارک ہوٹل میں پاس اوور تقریب میں بم دھماکے کے بعد بہرحال

اسرائیلی حکومت کا نقطہ نظر ڈرامائی طور پر بدل گیا۔ چنانچہ اسرائیلی حکومت نے ڈیفنس شیلڈ کی منظوری دیتے ہوئے دفاع سے جارحیت کی طرف منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ اس ڈیفنس شیلڈ کی منظوری کے بعد بات صرف سینکڑوں گرفتاریوں اور ہلاکتوں سے کہیں آگے چلی گئی۔ مثلاً:

- اوسلو معاہدے کے بعد پہلی بار اسرائیل نے اپنے دفاع کی ذمہ داری خود سنبھالی۔ ورنہ اس سے پہلے یہ ذمہ داری فلسطینی سیکیورٹی ادارے کی تھی، جس کے نتیجے میں ایریا- اے دہشت گردوں کے لیے محفوظ ترین پناہ گاہ ثابت ہوا تھا، تاہم ڈیفنس شیلڈ کے بعد صورت حال بالکل الٹ ہوگئی۔
- لبنانی لیڈر حسن نصراللہ کے بقول (اور دیگر عربوں کی نظر میں بھی) اس سے قبل اسرائیل کا دفاع مکڑی کے جالے سے زیادہ محفوظ اور مضبوط نہ تھا۔ یعنی دیکھنے میں مضبوط تھا مگر آزمائش کا مقابلہ نہ کرسکا۔ عربوں کا اندازہ تھا کہ اسرائیلی تھک چکے تھے اور جنگ سے تنگ آگئے تھے لہٰذا اب جنگ پر آمادہ نہ تھے اور اس ضمن میں کسی عظیم مقصد بلکہ قوم تک کو اہمیت دینے پر تیار نہ تھے۔ تاہم IDF نے اس کے خلاف کارردگی کا بھرپور مظاہرکیا۔

ایسے آپریشنوں کے نتیجے میں فلسطین کی دہشت گردانہ صلاحیت بتدریج کم ہوتی گئی۔ کیونکہ سینکڑوں دہشت گرد یا تو مارے گئے یا پکڑ لیے گئے، اور ورکشاپیں، جہاں اسلحہ بنتا تھا، تباہ کردی گئیں۔

- ایسے آپریشنوں کے بعد مغربی کنارے کے علاقے میں اسرائیلیوں کے لیے کارروائی کرنا بے حد آسان ہوگیا۔ اس کے نتیجے میں دہشت گرد تنظیمیں نہ صرف کارروائی کرنے کے قابل نہ رہیں بلکہ انہیں خود اپنا دفاع کرنا بھی مشکل سے مشکل تر ہوتا گیا۔

آپریشن سے قبل مغربی کنارے کے دہشت گردوں کے ہاتھوں اسرائیلیوں کی بے شمار ہلاکتیں ہوئیں مگر آپریشن کے بعد یہ سلسلہ رُک گیا۔

ان تمام اسباق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اولین ترجیح جارحانہ کارروائی کو دینی چاہیے۔ دوسرے درجے پر فلسطین کے گرد باڑ لگانا جب کہ آخر میں دفاعی کارروائی موثر ثابت ہوتی ہے۔ یہ اصول کہ

جارحیت بہترین دفاع ہے جسے دہشت گردی کے دوسرے مثلاً معاشی، سیاسی، نفسیاتی، تہذیبی، قانونی محاذوں پر بھی کامیابی سے استعمال کیا گیا ہے۔

کیا مقامی سوسائٹیاں دہشت گردی کو شکست دے سکتی ہیں؟

مقامی سوسائٹیاں دہشت گردی کے خلاف یقیناً جنگ جیت سکتی ہیں۔ البتہ اس کے لیے دہشت گردوں کی صلاحیت کار اور چالوں کو ناکام بنانا ہوگا۔ اس کے لیے نہ صرف دہشت گردوں کا خاتمہ ہونا چاہیے بلکہ ان کا بھی جو دہشت گردی کو سیاسی، معاشی، عسکری اور آڈیالوجی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ دہشت گردی ان گروہوں کا ہتھیار ہے جنہوں نے اسرائیل کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ عالمی سطح پر یہ ان انتہاپسند ریڈیکل مسلمان گروہوں کا ہتھیار ہے جو تمام غیر مسلموں کو شکست دے کر پھر سے دنیا میں اسلامی خلافت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ان انتہاپسندوں کی کارروائیوں میں ذرا بھی بزدلی دکھائی گئی تو اس میں اور اضافہ ہوگا اور پوری انسانیت اس سے متاثر ہوگی۔ بنیاد پرست اسلامی تصورات کی خوف ناک چالوں سے پورے عالم انسانیت کو خطرہ ہے۔ تاہم ایسی کارروائیاں کرنے والی تنظیموں کا اسرائیل۔فلسطین جھگڑے سے کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے۔ ایرانی شیعہ انقلابی لیڈرشپ اور القاعدہ کی مرکزی تنظیم جو ان دہشت گردانہ کارروائیوں کی سرپرستی کرتی ہیں یہ فلسطین اور اسرائیل کے جھگڑے میں فریق نہیں ہیں۔ تاہم ان تمام گروپوں اور ان کی سرپرست تنظیموں کو ۱۹۸۹ء میں سوویت یونین کے افغانستان سے انخلاء، اسرائیل کی ۲۰۰۵ء میں غزہ سے پسپائی، اور ۲۰۰۲ء میں انخلاء اور میڈرڈ پر حملے کے نتیجے میں عراق سے واپسی نے حوصلہ دیا ہے۔ بنیاد پرست مسلمانوں نے انخلا اور واپسی کی ایسی کارروائیوں کو دہشت گردی کی چالوں اور ان کے نتیجے میں اسلامی آئیڈیالوجی کی کامیابی اور قوت قرار دیا ہے۔ اب ان انتہاپسند مسلمانوں کو فلسطینی اتھارٹی میں حماس اور مصر میں اخوان المسلمین کی سیاسی کامیابی سے مزید تقویت حاصل ہوئی ہے اور عراق میں عوامی استحکام اور متحدہ فوجوں کی مشکلات میں یہی قوتیں اضافہ کر رہی ہیں۔